© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ثریا ڈار

سید المفسرین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے اسّی سال بعد مغل حکمران محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے چار سال قبل ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (فروری ۱۷۰۳ء) میں یوپی کے ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ "پھلت" میں پیدا ہوئے۔ جہالت اور خود غرضی کے اس تاریک دور میں ایک طرف لوگ حق و انصاف اور مذہب و اخلاق سے بہت دور ہٹ چکے تھے تو دوسری طرف خارجی اور داخلی قوتیں مسلمانوں کی باہمی نااتفاقیوں اور گروہ بندیوں سے فائدہ اٹھا کر دینِ اسلام اور حکومت پر ڈاکے ڈال رہی تھیں۔ اس وقت شدت سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی جلیل القدر عالم، نڈر مجاہد اور عظیم مفکر پیدا ہو جو اسلام کے نظامِ عقائد کے احیا اور مسلم معاشرے کی معقول تربیت و اصلاح کے لیے انقلابی روح پھونک سکے۔ بدنظمی اور انتشار و خلفشار کے اس دور میں حالات کے خطرناک نتائج کو دور رس نگاہوں سے دیکھنے والی شاہ ولی اللہ کی ذات ستودہ صفات تھی۔ جو عارف کامل، شرعی علوم میں محقق امام اور میدانِ حکمتِ عملی کے شاہ سوار تھے۔ آپ برصغیر میں محی السنۃ ، وارثِ کمالاتِ نبوت اور حجۃ الاسلام ثابت ہوئے، ان کے فیوض و کمالات سے ملک و ملت اور نظامِ اسلام کو حیاتِ تازہ حاصل ہوئی۔ علم و معرفت کے اس منبع نے پر آشوب دور اور دردناک حالات میں پیامِ محمدی کی از سرِ نو تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ گویا حضرت ممدوح کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح و تنظیم تھی۔ مولانا شبلی نعمانی تاریخ علم الکلام میں رقم طراز ہیں :

"ابنِ تیمیہ اور ابنِ رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابنِ رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"[1]

---

[1] علامہ شبلی نعمانی، تاریخ علم الکلام۔ ص ۸۸ - جاوید پریس کراچی، طبع اول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی سترھویں صدی عیسوی کے تاریک اور حوصلہ شکن دور میں ہند کی اسلامی تاریخ میں ایک عظیم مفکر اور مجدد پیدا ہوتا ہے، جس کی نگاہِ دوررس غزالی اور ابنِ رشد کو بھی مات کر دیتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ نسب والد بزرگوار کی طرف سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب اور والدہ محترمہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے، جس کی توضیح آپ نے اپنے رسالہ "امداد فی ماثر الاجداد" میں اس طرح فرمائی ہے۔

"سلسلۂ نسب این فقیر بامیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ می رسد باین طریق فقیر ولی اللہ ابن الشیخ عبد الرحیم بن الشہید وجیہہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود ..... بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم"[۲]

اسلامی حکومت کے آغاز میں ہندوستان میں وارد ہونے والے اس خاندان کے پہلے بزرگ شمس الدین مفتی رہتک تھے، آپ کے بڑے بیٹے کمال الدین مفتی اور ان کے بعد شیخ عبد الملک، قاضی کبیر الدین، قاضی قاسم اور سب سے آخر میں قاضی قوام الدین عرف قاضن بدستور اسی منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ قاضی قوام الدین کے بیٹے محمد کی شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی، لیکن ان کے صاحب زادے شیخ احمد جوانی میں رہتک لوٹ آئے تھے۔ شیخ احمد کے صاحب زادے منصور اور پوتے شیخ معظم بھی جلالتِ علمی میں ممتاز تھے۔ شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہہ الدین (شاہ ولی اللہ کے دادا) نامور عالمِ دین اور صاحبِ دل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی بھی تھے۔ شاہ وجیہہ الدین کے فرزند شیخ عبد الرحیم اپنے وقت کے متبحر عالم، نامور صوفی اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ وہ ظاہری و باطنی علوم کے حامل اور دنیاوی عقل و فراست میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ دربارِ شاہی سے الگ تھلگ رہ کر درس و ارشاد میں مصروف رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے فقہ حنفی کی جامع کتاب "فتاویٰ عالم گیری" کی ترتیب و تدوین میں ان کو تعاون کی دعوت دی، جسے آپ نے دینی خدمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ گویا اس خاندان کا ہر فرد آسمانِ علم کا مہر جہاں تاب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت اور مجدد ملت شاہ ولی اللہ علمی تبحر، فضل و کمال اور خداداد قابلیت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

---

[۲] شاہ ولی اللہ، امداد فی ماثر الاجداد۔ ص ۱۵۲۔ مطبع احمدی طبع دوم ۱۸۸۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگرچہ اس جلیل القدر خاندان کا ہر فرد فاضل اور عالم تھا لیکن اس کے گزشتہ اعزاز و اقتدار کو قائم رکھنے اور ان میں ایک نئی روح پھونکنے میں پیش پیش شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ صاحب نے آئندہ نسلوں کی کامیابی کے لیے ایک ایسا بیج بو دیا جو بعد ازاں ان کی ان تھک کوششوں سے بہت پھلا پھولا۔ اس شریف و نجیب خاندان کو دوسرے علمی خاندانوں پر فضیلت و ترجیح بھی آپ ہی کے طفیل نصیب ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب بچپن ہی سے ذہین و فطین، قوی الحافظہ اور بزرگانہ متانت کے حامل تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی کتب پڑھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی ارکان و فرائض بھی تدریجاً سیکھ لیے۔ دس سال کی عمر میں فارسی کی نوشت و خواند میں مہارت حاصل کر کے "شرح ملا جامی" اور "شرح الکافیہ" تک پہنچ گئے تھے۔ صرف و نحو پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پندرہ سال کی عمر میں تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام اور منطق وغیرہم کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ان تمام علوم میں متعدد کتب و رسائل کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں آپ کی شادی کر دی گئی۔ والد بزرگوار نے مختلف امراض کے غلبے کے باعث آپ کو بیعت و ارشاد کے ساتھ مسندِ درس و تدریس پر فائز کر دیا اور پورے بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کا درس دیتے رہے۔ جیسا کہ آپ نے خود انفاس العارفین میں فرمایا ہے۔

"بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کما بیشی بدرس کتب دینیہ و عقلیہ مواظبت نمود و در ہر علمی خوض واقع شد"[۳]

شاہ ولی اللہ علماً و عملاً ایک عظیم مفکر اور مجددِ کامل تھے۔ ہندوستان کے عوام و خواص اور اس عہد کے بڑے بڑے اساتذہ اور ماہرینِ فن آپ سے مستفید ہوئے۔ "مدرسہ رحیمیہ" میں بارہ سال تک درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۱ء میں زیارتِ حرمین شریفین سے سعادت اندوز ہونے کا شوق دل میں جاگزین ہوا۔ خود ارشاد فرماتے ہیں:

"بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین محترمین در سر افتادہ"[۴]

۳۔ شاہ ولی اللہ، الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف۔ ص ۵۔ مطبع احمدی۔ طبع دوم ۱۸۸۴ء

۴۔ ایضاً، ص ۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۱۴۳ھ/ ۳۱-۱۷۳۱ء کے آخر میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ۱۱۴۴ھ/ ۳۲-۱۷۳۲ء میں ایک سال وہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں دربارِ قدسی سے آپ پر فیوض و برکات کی بے انتہا بارش ہوئی۔ سفرِ حرمین کے دوران میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے نامور اساتذہ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت سے واپسی پر شیخ ابراہیم بن الحسن المدنی سے حدیثِ مسلسل کی بھی سند و اجازت حاصل کی۔ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۳ء میں بروز جمعہ وطنِ مالوف پہنچ کر دوبارہ والدِ ماجد کے مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سفرِ حج سے قبل تقریباً انتیس سال کی عمر تک تصنیف و تالیف کی بجائے درس و تدریس ہی میں مصروف رہے۔ اب آپ کا تمام وقت درس و تدریس، ترویج کتاب و سنت، تلقین معارف و حقائق، مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔

حجاز سے واپسی کے بعد تقریباً ۳۲ برس کی عمر میں آپ نے تجدید و احیائے دین کے کام کا آغاز کیا۔ ابھی اصلاحی کام کو شروع کیے ہوئے بمشکل چار سال ہوئے ہوں گے کہ نادر شاہ کے حملے نے ہندوستان کو عموماً اور دار السلطنت دہلی کو خصوصاً زیر و زبر کر دیا۔ اس دوران میں مسلمانوں کی پست ہمتی، بے حمیتی اور بے غیرتی انتہا کو چھو رہی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوئی عملی تحریک تو شروع نہ کی البتہ ایک طویل عرصے تک تعلیم و تربیت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کا میل اور دماغوں کا زنگ اتارنے کا ارادہ کیا۔

برصغیر میں عرصۂ دراز سے ہندی مسلمانوں کا یہ طریق کار چلا آ رہا تھا کہ وہ قرآن پاک کی تلاوت محض کاروباری برکت کے لیے کرتے یا پھر قرآن پاک کو قسمیں اٹھانے کے لیے استعمال کرتے۔ ہندوستان کے مروجہ نصاب یعنی درسِ نظامیہ میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ حدیث کے علوم کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ فقہ میں مذاہب اربعہ کی کھینچ تان اور باہمی تعصب کا دور دورہ تھا۔ اجتہاد کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ عوام اوہام پرستی، گمراہی اور تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن تھے۔

حجاز سے واپسی کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی تحریک کا پہلا قدم قرآن پاک کا فارسی ترجمہ اور اس کی مختصر شرح تھی، جس پر علمائے ہند کی برہمی ارادۂ قتل کی صورت میں آشکارا ہوئی۔ شاہ ولی اللہ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی دینی یا سیاسی تحریک کے لیے قرآن کریم کو مشعلِ راہ بنایا۔

قرآن پاک کا یہ ترجمہ لفظی و معنوی صحت اور احتیاط کے اعتبار سے اب تک بے مثال ہے۔

شاہ ولی اللہ نے علمِ تفسیر پر بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بہت کارآمد اور مشہور کتاب ہے۔ اس تفسیر سے فہمِ قرآن میں جو الجھنیں اور رکاوٹیں تھیں، دور ہو گئیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد علمِ حدیث کا ذوق و شوق بھی جاتا رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس کو مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لیے از سرِ نو زندہ کیا۔ شاہ صاحب نے سفرِ حجاز کے دوران میں جلیل القدر اساتذہ سے علومِ حدیث کی سند بھی حاصل کی۔ حدیثِ رسول اللہ آپ کی غذائے علمی تھی۔ ملفوظات میں شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

"علمِ حدیث از مدینہ آوردہ، پدرِ من وقتِ رخصت از مدینہ استاد خود عرض کرد داد خوش شد کہ ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث۔"[۵]

گویا آپ نے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر سندِ حدیث حاصل فرمائی۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ، ان کے جانشین اور تلامذہ وہ علما و فضلائے کرام ہیں، جن کے طفیل ہندوستان میں حدیث نے اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ کوئی اسلامی ملک اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

شاہ ولی اللہ اپنے وصیت نامہ "وصیتِ ششم" میں طریقِ تعلیمِ دین کے تحت فرماتے ہیں کہ "جب طالبِ علم کو عربی زبان پر قدرت ہو جائے تو موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ المصمودی پڑھائی جائے۔ اسے کسی حال میں نہ چھوڑا جائے کہ یہ علمِ حدیث کی اصل و اساس ہے۔ اس کے پڑھنے میں بہت ہی فیض ہے۔"[۶]

حجاز سے واپس آ کر آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کیا اور طالب علموں کی کثیر تعداد

---

۵ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی، ص ۹۳۔ مطبع مجتبائی میرٹھ۔ ذی قعدہ ۱۳۱۴

۶ ابو یحییٰ محمد اسمٰعیل گودھروی، وصیت نامہ۔ وصیت ششم۔ ص ۷۔ جامع برقی پریس دہلی، ۱۹۳۲ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باعث مدرسہ رحیمیہ کی وسعت تنگ ہوگئی۔ اس لیے محمد شاہ رنگیلے نے دہلی شہر میں ایک عالی شان حویلی دی، جس میں آپ نے دار الحدیث قائم کیا۔ اس میں ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء تک تشنگان علم حدیث نبوی دور دراز سے جوق در جوق اپنی پیاس بجھانے آتے رہے۔ شاہ صاحب کے درس حدیث اور ان کی کتابوں سے ہندوستان میں ان کے منصب تجدید و احیائے اسلام کی تکمیل ہوئی اور یہی ان کا مقصدِ عظیم تھا۔ تفسیر و حدیث کے بعد شاہ صاحب نے مذاہبِ فقہ اور مسئلۂ تقلید و اجتہاد میں ایک معقول اور متوسط طریق اختیار کیا۔ انھوں نے چاروں مذاہبِ فقہ کے اختلافات کی بنیاد کو واضح کرنے کے لیے ایک کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" لکھی۔ شاہ صاحب مذاہبِ اربعہ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ انھوں نے نہ جانب داری سے کام لیا اور نہ دوسرے مذاہبِ فقہ پر نکتہ چینی کی۔ اپنی تصنیف "تفہیماتِ الٰہیہ" میں لکھتے ہیں کہ "ابو حنیفہ اور شافعی کے مذاہب زیادہ مشہور ہیں اور مسلمانوں میں زیادہ پیرو بھی ان ہی کے پائے جاتے ہیں۔ کتابیں بھی ان ہی کی زیادہ ہیں۔ فقہا، محدثین، مفسرین، متکلمین و صوفیا زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں اور حکومتیں اور عام لوگ زیادہ تر مذہبِ حنفی پر قائم ہیں۔ اس وقت جو امرِ حق ملاءِ اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کو یک جا کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو دواوینِ حدیث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے جو اُن کے موافق ہوں، ان کو باقی رکھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے، اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اور دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں، ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور اگر ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کر لیے جائیں اور دونوں پر عمل کرنا صحیح قرار دیا جائے۔"[۴۵]

ان علوم کی ترویج و اشاعت کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مرکزی جماعت بنائی۔ اس جماعت کے افراد مولانا محمد عاشق پھلتی، مولوی نور اللہ بڈھانوی اور مولانا محمد امین کشمیری وغیرہم تھے۔ یہ جماعت صوفیا و علما اور امرا و رؤسا کے حلقوں میں رشد و ہدایت اور تعلیم کے ذریعے انقلابی تحریک کی اشاعت کرتی رہی۔

---

۴۵ شاہ ولی اللہ، تفہیماتِ الٰہیہ۔ جلد اول۔ ص ۲۷۹، ۲۸۰۔ مطبع نجیب بجنور حیدر آباد ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد، متکلم اور صوفی تھے۔ انھوں نے اصولِ عقائد، علم منطق، علم معانی، علم ہندسہ و حساب اور علم ہیئت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے درس و تدریس اور تصانیف سے ہندوستان میں علوم و معارف کے دریا بہا دیے۔ آپ سے بے شمار ملکی اور غیر ملکی حضرات نے استفادہ کیا۔ آپ کی فراوانیِ علم کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم فرماتے ہیں کہ:

" انصاف این است کہ اگر وجودِ او در صدرِ اوّل و زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد"[۸]

شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے فرائض منصبی کو نہایت آزادی، مستعدی اور جواں مردی سے انجام دیا۔ آپ نے عزمِ صمیم کر لیا تھا کہ سرزمینِ ہند میں کتاب و سنت کا ایسا مضبوط علم گاڑ دیا جائے جو کبھی سرنگوں نہ ہونے پائے اور آپ اپنے اس بنیادی مقصد میں کامیاب رہے۔ اس کی تائید میں شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں:

" ہم شاہ صاحب کو محض کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے ورنہ جہاں تک علمی تبحر، دماغی قابلیت، مجتہدانہ نظر، سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے، دنیائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے، جن سے آپ پیچھے رہے ہیں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر، حدیث، تصوف، فقہ، تاریخ، علم الکلام غرضیکہ علومِ اسلامی کی کوئی شاخ نہیں، جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شاملِ حال تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے کندن ہو جاتی ہے"[۹]

تاریخِ اسلام میں بہت کم ہستیاں آپ کے پایہ کی گزری ہیں اور ہندوستان میں تو خصوصاً اس مرتبے کا آدمی کوئی ہوا ہی نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں :-

" نعمت عظمیٰ برین صفت آنست کہ اورا خلعت فاتحیت دادند و فتح دورۂ بانپسیین بردست

---

۸ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء۔ ص ۴۳۰۔ مطبع نظامی واقع کان پور طبع الاول ۱۲۸۰ھ

۹ شیخ محمد اکرام، رود کوثر۔ ص ۵۵۱۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔ طبع ششم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دے کر وند[10]

شاہ صاحب کے عہد میں مغلیہ حکومت کے اقتدار کی جڑیں کمزور ہو کر اکھڑتی جا رہی تھیں۔ غیر اسلامی طور طریقوں کو اپنانے، عیش و عشرت کی شمعیں روشن رکھنے اور قومی و ملی وجود کے احساس سے بے گانہ رہنے کے باعث حاکم و محکوم طبقے کے لوگ حد درجہ کمزور، کھوکھلے اور آرام طلب ہو گئے تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحب مسلمانوں کی طرف اژدہوں کی طرح بڑھنے والے گوناگوں خطرات کا الارم دے کر انھیں خبردار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جیسا کہ آپ کے شعر سے واضح ہوتا ہے:

"کان نجوما او مضت فی الغیاھب عیون الأفاعی او رؤس العقارب"[11]

لیکن اس کے باوجود مسلمان قوم اپنی کاہلی اور سستی کے باعث خواب خرگوش کے مزے لیتی رہی اور شاہ صاحب مسلمانوں کے دینی و مذہبی وجود کے تحفظ کے لیے اپنا عمدہ اور ٹھوس کام سرانجام دے گئے۔ شاہ صاحب نے سیاسی انحطاط و زوال کے بدترین دور میں دینی علوم کی جس طرح تبلیغ و اشاعت کی، یہ ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً اور باقی دنیا کے مسلمانوں پر عموماً شاہ صاحب کا احسان ہے۔ صاحبِ اتحاف النبلا شاہ صاحب کے علم و فضل اور اشاعتِ حدیث کی تعریف میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

"جناب شاہ ولی اللہ کا علومِ متداولہ میں وہ پایہ تھا، جس کا شمہ بھی بیان کرنے سے انسانی طاقت محض عاجز ہے۔ آپ فنونِ عقلیہ میں وہ دست گاہ رکھتے تھے جس کا عشرِ عشیر بھی دوسروں کو نصیب نہ تھا۔ قطع نظر ان تمام علوم کے حدیث میں اپنے تمام ہم عصروں سے امتیازیہ قوت رکھتے تھے اور اس علم میں مقتدائے وقت اور فریدِ عصر شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا کہ مخالف و موافق پر اس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ ابتدائی زمانے سے اگرچہ آپ کے فضل و کمال کے جھنڈے ایک عالم میں گڑ چکے تھے اور آپ کے نام کا امتیازی پھریرا ہندوستان سے لے کر عرب و عجم تک لہرا رہا تھا لیکن جب آپ عرب کے مقدس و مبارک سفر سے واپس تشریف لائے اور علمِ حدیث کی اور بھی

---

[10] نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء۔ ص ۴۲۹

[11] شاہ ولی اللہ، اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم۔ ص ۲۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشاعت کی تو آپ اپنی مقبولیت کے سبب سے واقعی ہر دل عزیز ہو گئے اور اعزاز و اقتدار کا آفتاب پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگا۔ حقیقت میں جناب شاہ ولی اللہ کی درس گاہ اس وقت علوم حدیث و تفسیر کا مخزن اور حنفی فقہ کا سرچشمہ تھی۔ اس مقدس اور بلند پایہ علم کی خدمت جس قدر آپ سے وجود پذیر ہوئی، فی الواقع ہندوستان میں کوئی شخص اس کا دعوے دار نہیں بن سکتا۔ "عمل بالحدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور ناقابل کاشت زمین میں آپ کے والد بزرگوار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے ڈالا اور آپ نے اپنی ان تھک کوششوں سے اسے یہاں تک سینچا کہ چند ہی روز میں اس کا پودا اُگا اور سر سبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگا اور اس کے پھل پھول سے لوگ جھولیاں بھر بھر کر لے جانے لگے۔ اسے ہندوستان کی بڑی خوش نصیبی کہنا چاہیے کہ جہاں علم حدیث کا نام و نشان تک زبان پر نہ لیا جاتا تھا، آج اس کے گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علم حدیث کے ترانے سنے جاتے ہیں۔"[۱۲]

شیوخ حرم بھی موصوف کی فہم و فراست، شرح حدیث، معانی حدیث اور توضیح مطالب کے قائل تھے۔ چنانچہ شیخ ابو طاہر کردی موصوف کے متعلق فرماتے تھے:

"انہ یسنعنی اللفظ وکنت اصحح منہ المعنی"[۱۳]

اگرچہ اس جلیل القدر اور محترم خاندان کے ہر فرد کی خوش بیانی، برجستہ گوئی اور فصاحت و بلاغت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے لیکن شاہ ولی اللہ کا مقام ان سب سے بلند تر ہے، کیوں کہ آپ ان تمام صفات میں غیر معمولی حیثیت کے حامل تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں علوم اسلامیہ کی تاریخ میں ان کا کوئی ثانی و ہمسر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید عبدالحی لکھنوی شاہ صاحب کے حالات کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شیخ امام الھمام، حجۃ اللہ بین الانام، امام الائمۃ، قدوۃ الامۃ، علامۃ العلماء وارث الانبیاء، آخر المجتھدین، اوحد علماء الدین، زعیم المتضلعین بحمل اعباء الشرع المتین، محی السنۃ ومن عظمۃ اللہ بہ علینا المنۃ شیخ الاسلام قطب الدین احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری الدھلوی۔"[۱۴]

---

۱۲ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلا۔ ص ۴۱۷ - ۴۳۰ -

۱۳ سید عبدالحی لکھنوی، نزہۃ الخواطر۔ جلد ۶، ص ۴۰۴ - دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن - ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء۔

۱۴ ایضاً، ص ۴۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب انشاپردازی اور تقریر و بیان میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ کی بلند پایہ کتب، مکاتیب و خطوط اور علمی مناظروں سے آپ کی انشاپردازی کا پتا چلتا ہے۔ تقریر و بیان میں بلا کا جادو تھا۔ بڑے بڑے مناظروں اور علمی مجلسوں میں ان کی فصاحت و بلاغت سے موافق و مخالف عش عش کر اٹھے۔ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی تھی۔ عربی میں آپ کے قصائد اور فارسی میں بعض غزلیں اور رباعیاں موجود ہیں۔ فارسی میں آپ اپنا تخلص امین فرماتے تھے۔ گویا شاہ صاحب کو تمام علوم دینی و دنیوی پر عبور حاصل تھا۔

شاہ ولی اللہ بہت سی عظیم الشان اور اہم علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے ایک سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جو زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکیں بلکہ بعض کتابوں کا تو نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔ ان میں چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد اکاون (۵۱) کے قریب ہے، جن میں سے نصف کتابیں دست یاب ہیں اور باقی ابھی تک نادر اور نایاب ہیں۔ بعض اربابِ تحقیق کے مطابق کچھ ظالموں نے نہ صرف کتابیں لکھ کر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے منسوب کر کے شائع کیں بلکہ ان کی کتابوں کی عبارتوں کو بھی بدل دیا۔ یوں تو آپ کی تمام تصنیفات بلند پایہ ہیں لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مشہور "حجۃ اللہ البالغہ" ہے۔ آپ کی متعدد تصنیفات تفسیر، حدیث، اسرارِ شریعت، تصوف، سیر، عقائد اور مناظرہ میں چھپ چکی ہیں۔

شاہ صاحب کی ہر تصنیف اپنی مثال آپ ہے۔ ظلمت اور تاریکی کے اس دور میں شاہ صاحب اپنے مقصدِ اعلیٰ کو سرانجام دینے کے سلسلے میں ایک مکمل لائحہ عمل مرتب کر گئے۔ اس کے بعد کوئی انقلابی قدم اٹھانا آپ کے بعد میں آنے والوں کا کام تھا، جیسے آپ کے صلبی پوتے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید اور دوسرے روحانی پوتے سید احمد شہید نے مناسب وقت پر سرانجام دیا۔

موت ہر چھوٹے بڑے کے لیے مقدر ہے، افسوس ہے شاہ صاحب ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں خفیف سی علالت کے بعد سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ جہان آباد سے جنوب میں پرانی دلی میں مہندیوں کے اندر اپنے والد شیخ عبدالرحیم کے پہلو میں راحت فرما ہوئے۔ اس خاندان کے ہر فرد کے آفتابِ علمِ حدیث ہونے کے باعث یہ قبرستان "محدثین کے قبرستان" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب کی پوری عمر کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ حیاتِ ولی کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ "جناب شاہ صاحب عمر کے تریسٹھ برس طے کر چکے تو چند روز خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں عازم سفر آخرت ہوئے"[۱۵] لیکن اس کے برعکس ملفوظاتِ عزیزیہ کے جامع نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ قول نقل کیا ہے:

"عمر شریف یعنی شصت یک سال و چہار ماہ شد چہارم شوال تولد گشت۔ در بست نہم محرم وفات یافت، تاریخ تولد شاہ ولی اللہ چہارم شوال و چہار شنبہ ۱۱۱۴ ہجری بود، تاریخ وفات او بود امام اعظم دین دیگر ہائے دل روزگار رفت بست نہم محرم وقت ظہر"[۱۶]

اگرچہ سن ولادت و وفات میں کوئی اختلاف موجود نہیں لیکن حیاتِ ولی میں آپ کی عمر تریسٹھ برس لکھی گئی ہے۔ جب کہ آپ کے فرزند گرامی نے آپ کی عمر اکسٹھ برس اور چار ماہ لکھی ہے اور یہی صحیح ترین معلوم ہوتا ہے۔

خداوند کریم نے آپ کو چار مایہ ناز فرزند عطا فرمائے تھے جو ہر لحاظ سے آپ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ (۱) شاہ عبدالعزیز (۲) شاہ رفیع الدین (۳) شاہ عبدالغنی (۴) شاہ عبدالقادر، شاہ ولی اللہ کے ایک اور بیٹے شاہ محمد دہلوی بھی تھے جو چاروں بھائیوں سے مختلف البطن اور سب سے بڑے اخیافی بھائی تھے۔ ان کا ذکر مولوی محسن بن یحییٰ الترہتی نے الیانع الجنی میں اس طرح کیا ہے۔

وکان لعبد العزیز اخ اقدم منه سنا اسمه محمد وکان اخا لابیه اخذ عن ابیه وهو ایضا قدیم الوفاة رحمهم الله تعالیٰ[۱۷]

شاہ ولی اللہ صاحب کا پہلا عقد شیخ عبید اللہ صاحب پھلتی کی صاحب زادی فاطمہ کے ساتھ چودہ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ ان سے ایک صاحب زادے شیخ محمد عاشق صاحب ہوئے۔ اس لیے شاہ محمد کی وجہ سے بعض مقامات پر شاہ ولی اللہ اپنی کنیت "ابو محمد" لکھتے ہیں۔ چنانچہ "الارشاد

---

۱۵ رحیم بخش دہلوی، حیاتِ ولی، ص ۵۸۴۔ دین محمدی پریس مارچ ۱۹۵۵

۱۶ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی۔ ص ۴۰

۱۷ مولوی محسن بن یحییٰ الترہتی، الیانع الجنی۔ ص ۷۶۔ جید پریس دہلی، ۱۳۴۹ھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الی مہمات الاسناد (در مطبع احمدی دہلی) کے سرورق پر شاہ ولی اللہ کی کنیت "ابو محمد" درج ہے اور اس کتاب میں اس بات کو ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے۔

"ولد ولد قبل مولانا عبدالعزیز مسمی بمحمد فکنی بابی محمد۔"[۵۸]

۵۸۔ شاہ ولی اللہ، الارشاد الی مہمات الاسناد۔ ص ۲۔ مطبع احمدی۔ سن ندارد

تعلیماتِ غزالی

مولانا محمد حنیف ندوی

فقہ و قانون کی پابندیوں میں اگر احکام و مسائل کی اصل روح مفقود ہو جائے تو یہ پابندیاں تہذیب و تمدن کے لیے طوق و زنجیر بن جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر روح و معنی، فقہ و قانون کی پابندیوں کو گوارا کرنا چھوڑ دے تو اس سے دینی انارکی پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ غزالی کی چشمِ بصیرت نے سب سے پہلے اس خطرے کو محسوس کیا اور احیاء العلوم میں تفصیل کے ساتھ فقہ و تصوف میں رشتہ و تعلق کی جو نوعیت ہے، اس کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

تعلیماتِ غزالی میں احیا کے ان ابواب کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ ہے جن میں کہ غزالی نے ہر ہر فقہی مسئلے کی روح اور حکمت بیان کی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں فاضل مترجم نے مسئلہ تصوف کے جملہ اہم نکات کے بارے میں گراں قدر تشریحات پیش کی ہیں۔ تصوف کیا ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے تصوف کے کیا معنی ہیں؟ اس کی اصطلاحیں کن معانی اور مطالب کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں؟ اس کتاب میں ان تمام سوالات کا آپ کو تسلی بخش جواب ملے گا۔

صفحات ۵۷۲ قیمت ۴۰۔۰۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com